قرآن العظیم

پرویز صاحب کی زندگی کا مشن قرآنی فکر و تعلیم کی نشر و اشاعت ہے۔ اس کے متنوع ذرائع میں سے ایک اہم اور مؤثر ترین ذریعہ ان کا ہفتہ واری درس قرآن مجید ہے۔ پہلے تو یہ صرف مقامی تھا لیکن ٹیپ ریکارڈنگ اور وی۔ سی۔ آر کی ایجاد کے بعد، یہ پاکستان اور بیرونی ممالک تک میں پھیل گیا ہے اور نہایت خوشگوار نتائج مرتب کر رہا ہے۔ انہوں نے یہ سلسلہ ۱۹۵۳ء میں شروع کیا تھا لیکن وہ متفرق عنوانات پر مشتمل تھا۔ ۱۹۶۰ء سے انہوں نے مسلسل درس قرآن کی ابتدا کی جس کا پہلا دور دسمبر ۱۹۶۷ء میں تکمیل تک پہنچا اور مارچ ۱۹۶۸ء سے دورۂ ثانی کا آغاز ہوا۔ ان ہر دو تقاریب پر انہوں نے خصوصی درس دیئے۔ جن میں قرآن کریم کے ساتھ اپنی والہانہ وابستگی اور قرآن فہمی کے طریقوں پر نہایت مفید گفتگو کی۔ ان کے یہ درس قرآنی تعلیم کے سلسلہ میں مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی عام افادیت کے لئے ان کا اعادہ کیا جاتا ہے۔

درسِ اوّل —— تکمیلی دورۂ قرآن مجید (۱۹۶۷ء)

عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت!

یوں تو انسانی زندگی، سلسلۂ روز و شب ہی سے عبارت ہے، لیکن اس سلسلہ میں بعض کڑیاں ایسی بھی آ جاتی ہیں جنہیں بجا طور پر سرمایۂ حیات اور حاصلِ زندگی قرار دیا جا سکتا ہے۔ میری زندگی میں آج کا دن اس سلسلہ کی ایک ایسی ہی کڑی ہے۔ اس دن کی یاد، بقایائے زندگی میں، میرے لئے وجہ بالیدگیٔ روح اور باعث شادابیٔ قلب ہو گی۔

(۲) میں، قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں، اور یہی میری متاعِ حیات اور مایۂ افتخار ہے۔ میری زندگی کا ابتدائی دور قدامت پرستی کی تنگ ناؤں میں گزرا۔ کبھی مسجد کے حجروں میں، قال، اقول کی بحث و جدل میں اور کبھی خانقاہوں کے خلوت کدوں میں مسائلِ تصوف کی رہ نوردی میں۔ یہ وہ دور تھا جس میں چشم بند و گوش بند و لب بہ بند، معراج علم۔ اور بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید، — اوجِ روحانیت سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب

میرے شعور کی آنکھ بیدار ہوئی تو فکر و تدبّر کی تابندہ شعاعوں نے جمود کی اُن برفانی سلوں کو آہستہ آہستہ پگھلانا شروع کیا جو کورانہ تقلید اور اندھی عقیدت کے یخ خانہ (کولڈ سٹوریج) کی فطری پیداوار تھیں ـــــ میں، عقل و فکر کے چراغ گُل کر دینے والی ماضی پرستی کے تیرہ و تاریک غاروں سے نکل کر، ہمیشہ فہم و فراست سے اپنی راہیں آپ تراشنے کی دعوت دینے والی تابناک وادیوں میں کس طرح پہنچا، یہ ایک طویل داستان ہے جسے بیان کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔ بہرحال، ان وادیوں میں پہنچ کر، جب جمود و تعطل کی برفانی سلیں پگھلنی شروع ہوئیں تو ان کے نیچے دبی ہوئی شکوک و شبہات کی چٹانیں یوں اُبھرنے لگیں جس طرح عرقِ لیموں سے لکھے ہوئے حروف کاغذ کو آگ کے سامنے لانے سے ایک ایک کر کے نمودار ہوتے چلے جاتے ہیں، یہ دَور میری زندگی کا تلخ ترین زمانہ تھا۔ اس میں وہ جنت مجھ سے چھن چکی تھی جو فسونِ خود فریبی کی تخلیق تھی اور فردوسِ یقین آفریدہ کی طرف جانے والا راستہ نگاہوں کے سامنے نہیں آ رہا تھا۔ ریب و تشکیک کے سانپ متواتر ڈستے چلے جاتے تھے اور اُن کے زہر کا تریاق کہیں سے میسّر نہیں آ رہا تھا۔ میرے سابقہ ایمان کا ایک ایک گوشہ، اعتراضات کے طوفانوں کی نذر ہوتا جا رہا تھا ـــــ اور دلیل و برہان کی کوئی دیوار ایسی نہ تھی جو ان کی یورشوں کو روک سکے۔ میں حیرت کی ان وادیوں میں برسوں مارا مارا پھرتا رہا۔ عدمِ یقین کے نشتروں سے میرا قلب، بزنگِ غنچہ لبریز جراحت اور فقدانِ ایمان کی برقی سامانیوں سے میرا سینہ پروردۂ آغوشِ محشر بنا رہا۔ یہ ویسا ہی دَور تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومیؒ، کبھی پیچ و تابِ رازیؒ

شکوک و شبہات کی تلاطم خیزیوں میں صرف ایک روشنی کا مینار تھا جس نے میری کشتیٔ امید کو نذرِ طوفان ہونے سے بچا لیا۔ یہ مینار، یہ لنگر، یہ ساحل تھا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر میرا یقینِ محکم۔ جب اعتراضات کی اضطراب انگیز موجیں، خدا، وحی، آخرت پر ایمان کو متزلزل کرنے کے لئے اُٹھتیں تو یہ خیال ان کے راستے میں حائل ہو جاتا کہ جس ذاتؐ کی سیرت ایسی بلند ہو وہ نہ تو خود فریبی کا شکار ہو سکتی ہے، نہ فریب دہی کی مرتکب۔ اس لئے اُس نے جن حقائق کے مبنی بر صداقت ہونے کی شہادت دی ہے انہیں پرکھے بغیر جھٹک نہیں دینا چاہیئے۔ یہ تھا، عزیزانِ محترم سیرتِ محمدیؐ پر میرا ایمان، جس نے میری زندگی کے دھارے کا رُخ موڑ دیا۔ اور میں نے سابقہ توہمات سے خالی الذہن ہو کر قرآن کریم کو علم و بصیرت کی روشنی میں از خود سمجھنے کی کوشش شروع کی۔ اس ہمت طلب سفرِ زندگی، اور صبر آزما مراحلِ حیات میں مجھے کس کس سنگلاخ زمینوں سے گزرنا پڑا، اور ان میں مجھے کہاں کہاں سے راہ نمائی ملی، کیسی کیسی کوہکنی اور خارہ شگافی سے میرا واسطہ پڑا، اور میں نے کس جگر سوزی اور نفس گدازی سے راستے کے ان موانعات کو دُور کیا، یہ داستان پھر طویل ہے اور فرصت طلب۔ اس وقت میں صرف اتنا عرض کر دینے پر اکتفا کروں گا کہ میں قریب تیس[1] سال سے مسلسل قرآن کریم پر غور و فکر کرتا چلا آ رہا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں آج، بہ کمالِ عجز و نیاز لیکن بہ تمامِ حزم و یقین، اس

---

[1] اب پچاس سال۔

حقیقت کے اعلان کرنے کے قابل ہوں کہ خدا کی اس کتابِ جلیل کے ایک ایک لفظ کی صداقت پر میرا محکم یقین ہے۔ اور یہ ایمان علم و بصیرت پر مبنی اور دلائل و براہین پر استوار ہے۔ اس نعمتِ کبریٰ کے حصول پر جہاں میرا سرِ نیاز بحضور رب العزت سجدہ ریز ہے، وہاں میری جبینِ شوق، اُس ذاتِ اقدس، اُس چراغِ آفرینش، اُس شاہدِ دین و جانِ ایمان کی بارگاہِ عزت مآب میں سراپا سپاس ہے جس کے حسنِ سیرت کی جلوہ باریوں نے میری نگاہوں کو وہ نورِ بصیرت عطا کر دیا جس سے میں، قرآنی حقائق پر یقینِ محکم سے "از سرِ نو مسلمان" ہونے کے قابل ہو گیا۔ اور صرف مسلمان ہونے کے قابل ہی نہیں بلکہ خدائے زندہ کے متعلق، جو ہر دیدۂ بینا کے لئے بہارِ شگفتنی اور ہر گوشِ نصیحت نیوش کے لئے عیدِ شنیدن ہے۔ اقبالؒ کی ہم نوائی میں یہ کہنے کے قابل بھی کہ ؎

فاش گویم آں چہ در دل مضمر است　　　ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود　　　جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود

جب اس کتابِ عظیم کے حقائق، نگاہِ ذہن کو منور کرتے ہیں تو اُس کا ایک ایک ذرہ جوشِ انا الشرق سے رشکِ صد آفتاب ہو جاتا ہے، اور جب اس کے بصائر خلوت گاہِ قلب کو وسعت آشنا کرتے ہیں تو خونِ رگِ حیات کا ایک ایک قطرہ دعوائے انا البحر سے آفاق گیر و کائنات در آغوش ہو جاتا ہے۔ قرآن، عزیزانِ من! مذہبی دنیا کی جنتر منتر کی کتاب یا خالی پند و نصائح کا مجموعہ نہیں۔ یہ وہ ضابطۂ قوانین ہے جس کے مطابق یہ سارا کارگہِ کائنات اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ یہ وہ میزانِ عدل ہے جس میں افراد اور اقوام کے ایمان تُلتے، اور ان کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جو قوم اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتی ہے، اسے اس دنیا میں بھی سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہوتی ہیں اور وہ مستقبل (آخرت) کی خوش گواریوں اور شادکامیوں سے بھی نوازی جاتی ہے۔ جو اس راہ کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرتی ہے، وہ یہاں بھی ذلیل و خوار ہوتی ہے، اور آخرت میں بھی روسیاہ و شرمسار۔

خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ ؕ ذٰلِکَ ھُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ؁ (۲۲/۱۱)

قرآنِ کریم پر غور و تدبر ہی سے میں نے، اے جانِ گرامی قدر! اس ارشادِ خداوندی کو بھی سمجھا کہ جس شخص کو قرآن فہمی کی توفیق عطا ہو جائے، اس پر یہ فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے اسے دوسروں تک بھی پہنچائے۔ اس ارشادِ خداوندی کی روشنی میں میں نے یہ اپنی ذمہ داری سمجھی کہ ـــ دیکھا ہے جو کچھ میں نے، اوروں کو بھی دکھلا دوں۔ چنانچہ میں گذشتہ قریب تیس سال[1] ہی سے، اپنی بساط کے مطابق، اس فریضہ کی ادائیگی میں بھی مصروف چلا آرہا ہوں۔ میری تصانیف، میرے مقالات، میری تقاریر، سب اسی فریضہ کی ادائیگی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت درسِ قرآن کریم کو حاصل ہے کہ اس میں قرآنی حقائق اس طرح بار بار سامنے آتے ہیں کہ یہ آہستہ آہستہ ذہن کی گزرگاہوں سے آگے بڑھ کر قلب کی گہرائیوں تک میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ میں نے اس سلسلہ کو ۱۹۴۸ء کے قریب کراچی میں شروع کیا تھا۔ یہ وہاں مسلسل جاری رہا تا آنکہ میں ۱۹۵۵ء میں لاہور منتقل ہو کر چلا آیا۔

---

[1] اب پچاس سال۔

اور اس سلسلہ کو یہاں جاری کر دیا۔ ابتدائی دو سال، قرآن کریم کے بنیادی تصورات پیش کرنے میں صرف ہو گئے اور اس کے بعد ۱۹۶۰ء سے، اس کا مسلسل درس شروع کر دیا گیا۔ للہ الحمد! کہ سات سال سے زائد عرصہ دراز کی ہفتہ واری نشستوں میں یہ مبارک و مسعود سلسلۂ بایں حسن و خوبی، اب تکمیل تک پہنچ گیا ہے اور آج کی یہ بزمِ تبریک و تہنیت تقریب اسی کا جشنِ مسرت ہے۔ میں جب سترہ سال کی ان گزری ہوئی منزلوں پر نگاہِ بازگشت ڈالتا ہوں، تو میرا سر نیاز بدرگاہِ رب الناس، بصد تسلیم و تکریم جھک جاتا ہے کہ اس نے مجھے اس قدر حوصلہ طلب فریضہ کے بعد اس جوئے شیر کے لانے کی توفیق عطا فرمائی۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس میں جو قوانین و احکام اور اصول و اقدار مذکور ہیں۔ وہ محکمات ہیں یعنی ان کا مفہوم متعین ہے۔ لیکن ان کی تائید و شہادت میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں۔ وہ تشبیہات و استعارات کے انداز میں سامنے لائے گئے ہیں جنہیں اپنی اپنی اور اپنے زمانے تک کی علمی سطح کے مطابق سمجھا جا سکتا ہے ان حقائق کا تعلق، خارجی کائنات اور انسانی زندگی کے مختلف گوشوں سے ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان حقائق کے ادراک کے لئے، کائنات اور انسانی دنیا سے متعلق مختلف علوم تک دسترس ضروری ہے۔ لیکن یہ بھی واضح ہے کہ کسی ایک فرد کے لئے مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے کہ اسے ان جملہ علوم پر کامل دستگاہ حاصل ہو۔ اسے چند ایک علوم پر عبور، اور دیگر علوم کی مبادیات سے واقفیت تو ہو سکتی ہے، وہ جملہ علوم کا احاطہ نہیں کر سکتا ــــ بنابریں قرآنی حقائق کا کما حقہٗ ادراک، ایک فرد کا نہیں، ایک جماعت کا کام ہے۔ لہٰذا کسی فرد کو بھی اس کا دعوےٰ نہیں ہو سکتا کہ قرآنی حقائق کے متعلق اس نے سب کچھ سمجھ لیا ہے۔

دوسرے یہ کہ خود علم انسانی کی کیفیت یہ ہے کہ جوں جوں حقائق کائنات منکشف ہوتے جاتے ہیں۔ ان علوم کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ جوں جوں علمِ انسانی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، قرآنی حقائق نکھر اور ابھر سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں خود قرآن کریم نے کہا ہے کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)

ہم خارجی کائنات اور خود انسانی دنیا میں انہیں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے۔ تا آنکہ قرآن کا ہر دعوےٰ حقیقت بن کر ان کے سامنے آجائے۔

اس سے واضح ہے کہ جوں جوں انفس و آفاق کے حقائق مستور بے نقاب ہوتے جائیں گے، قرآن کی صداقتیں مشہود ہوتی چلی جائیں گی۔ لہٰذا انسانی تاریخ کے کسی دور میں بھی یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ قرآنی حقائق کے متعلق جو کچھ سمجھا جانا تھا وہ سمجھا جا چکا ہے۔ اس میں نہ اصلاح و ترمیم ہو سکتی ہے نہ حک و اضافہ ــــ جس طرح علوم سائنس کے متعلق ریڈنگ یونیورسٹی کے طبیعات کے پروفیسر ڈاکٹر جیمز آر للڈ نے کہا ہے کہ

دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لئے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے

اسی طرح قرآنی حقائق کے متعلق بھی بجا طور پر کہا جائے گا کہ اس ضمن میں

حرفِ آخر، آخری انسان کے حصے ہی میں آ سکتا ہے۔

یہ وجہ ہے جو میں نے کبھی یہ دعوے نہیں کیا کہ قرآن کریم کے متعلق جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ حرفِ آخر ہے اور اس میں سہو و خطا کا کوئی دخل نہیں۔ یہ افہام و تفہیم قرآنی کی بہرحال ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہے۔

میں اسے پھر دُہرا دوں کہ میں نے جو ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ قرآنی حقائق کو ہر دور کے انسانی علم کی سطح تک سمجھا جا سکتا ہے۔ تو یہ اُن حقائق کے متعلق ہے جنہیں قرآن کریم نے اپنے دعاوی کی تائید میں تشبیہات و استعارات کے انداز میں بیان کیا ہے۔۔۔۔ جس کتاب کو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہونا تھا اُس کے حقائق کو تشبیہات و استعارات کے انداز ہی میں بیان کیا جا سکتا تھا۔ جہاں تک انسانی زندگی کے لئے راہ نمائی کا تعلق ہے، اسے قرآن نے متعین انداز میں بیان کر دیا ہے جس میں نہ ابہام ہے نہ اختلاف۔ وہ نہایت واضح، متعین، اور صاف و سادہ ہے جس سے نہایت آسانی سے مستفید ہوا جا سکتا ہے۔

جہاں تک قوانین کا تعلق ہے، قرآن نے بجز چند احکام بیانی قوانین کے لئے صرف اصول دیئے ہیں اور اسے ہر دور کی ملت اسلامیہ پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، باہمی مشاورت سے، جزئی قوانین مرتب کرے۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے اور ان کے حدود کے اندر مرتب کردہ جزئی قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ یہ قوانین اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ ہوں گے۔ اسی کو اسلامی فقہ یا شریعت کہا جاتا ہے۔ قرآنی مملکت میں کسی فرد یا افراد کی کسی جماعت کو حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ فقہی قوانین مرتب یا نافذ کرے۔ یہ صرف اسلامی مملکت کا منصب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مذہبی پیشوائیت کا تصور ہی نہیں۔ مسلمانوں میں یہ تصور، ان کے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے جب دین نے مذہب کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے بنا دیئے گئے تھے۔

ان غیر متبدل اصولوں کو اقدار (VALUES) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حیوان اور انسان میں امتیازی خط، قدر (VALUES) کا تصور ہے۔ حیوان صرف اپنی طبیعی ضروریات کا احساس رکھتا ہے۔ وہ اقدار (VALUES) کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ یہ انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ طبیعی ضروریات کا بھی احساس کرتا ہے اور اقدار کا تصور رکھنے کے قابل بھی ہے۔ جب کسی معاشرہ میں اقدار کا تصور گم ہو جائے یا مدھم پڑ جائے، تو وہ معاشرہ انسانوں کی بستی نہیں رہتا۔ حیوانات کا انبوہ بن کر رہ جاتا ہے۔ جہاں صرف جنگل کے قانون کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اپنے احکام کی طرح ان اصول و اقدار کو بھی نہایت واضح اور متعین انداز میں بیان کیا ہے تاکہ اس باب میں کسی قسم کا ابہام و اختلاف نہ رہے۔ انہیں ہر شخص جو قرآن کی زبان سے واقف ہو، بادنیٰ غور و تدبر نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے

لیکن قرآن فہمی کے سلسلہ میں، ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جو "پل صراط" کے عوامی تصور کے مطابق "بال سے باریک اور تلوار سے تیز" ہوتا ہے کہ وہاں سے اگر پاؤں پھسلے تو انسان سیدھا جہنم کے گڑھوں میں جا گرے۔ وہ نازک ترین مرحلہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی خاص نظریہ یا تصور کو ذہن میں لے کر قرآن کی طرف اس لئے آتا ہے کہ اُسے اس سے اپنے نظریہ یا تصور کی تائید مل جائے، تو اُسے قرآن کی بارگاہ سے ایسی پھٹکار پڑتی ہے جو اس کے لئے ہر دو جہان میں وجہِ روسیاہی ہوتی ہے۔ قرآن کو اپنے خیالات کے تابع رکھنا شرکِ عظیم ہے۔ یہ اپنا دروازہ اس کے لئے کھولتا ہے

جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ، خالی الذہن ہو کر، اس کے آستانِ عالیہ پہ دستک دے۔ ہمارا قدامت پرست طبقہ، ماڈرن مسلمانوں کو یہ کہہ کر مطعون کرتا ہے کہ یہ مغرب کے نظریات کو ذہن میں رکھ کر قرآن سے ان کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ ان کے تمام نظریات و معتقدات کو، جن کی سند صرف اس قدر ہے کہ وہ قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں، ایمان کا درجہ دے کر قرآن کو ان کی تائید میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ اگر ماڈرن طبقہ کا یہ جرم ہے کہ وہ اپنے ذہن میں پہلے سے کچھ تصورات قائم کر کے قرآن کی طرف آتے ہیں، تو ہمارا یہ اسلاف پرست طبقہ اس جرم کا ان سے بھی زیادہ شدت سے مرتکب ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ ؎

مکتب و ملاّ و اسرارِ کتاب کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

تو اس سے یہی مقصود تھا۔ ماڈرن طبقہ تو پھر بھی کوئی ایک آدھ نظریہ مستعار لے کر قرآن کی طرف آتا ہوگا، یہ حضرات زندگی کے اصولوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی جزئیات تک ہر باب میں، متعین معتقدات اپنے ذہن میں رکھتے ہیں جن میں ذرا سی تبدیلی بھی کفر کے مرادف سمجھی جاتی ہے۔ اور پھر دعوے یہ کرتے ہیں کہ ہم قرآن کو سمجھتے ہیں۔ سوچئے کہ جو اس طرح آنکھیں بند کر کے، چلے، اسے سورج کی روشنی کیا فائدہ دے سکتی ہے؟

میں، برادرانِ عزیز! پوری دیانت داری سے عرض کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ میں نے قرآن کریم کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ میں اُسے شرک سمجھتا ہوں۔ جہاں تک متوارث نظریات کا تعلق ہے اُنہیں میں نے اُس زمانے میں قرآن کی کسوٹی پہ پرکھنا شروع کر دیا تھا، جب میں قدامت پرستی کے ظلمت کدوں سے عقل و فکر کی وادیوں کی طرف آیا تھا۔ اور جہاں تک عصرِ حاضر کے پیدا کردہ نظریات کا تعلق ہے، ان میں سے ایک ایک کو میں نے ہدفِ تنقید بنایا اور قرآن کی روشنی میں پرکھا ہے۔ لہٰذا، میرے فہمِ قرآنی میں، کہیں غیر شعوری طور پہ میرے اپنے خیالات کی آمیزش ہو گئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ لیکن میں نے دانستہ کبھی ایسا نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ اس کے لئے میں اپنے آپ کو خدا کے ہاں جواب دہ سمجھتا ہوں۔ ذمہ داری کا یہی شدید احساس ہے جس سے میری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ میں قرآن کے متعلق جب کبھی کچھ کہنے کے لئے لب کشائی کرتا یا کچھ لکھنے کے لئے قلم اُٹھاتا ہوں، تو میرا دل لرز جاتا ہے، میری روح پہ کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

یہ کچھ تو عزیزانِ من! میں نے اپنے متعلق کہا۔ آپ احباب جس التزام سے میرے درس میں شریک ہوتے رہے اور جس جذب و انہماک سے اسے سنتے رہے ہیں، وہ قرآن کے ساتھ آپ کی والہانہ وابستگی کی دلیل ہے، اور اس کے لئے آپ مستحقِ ہزار تبریک و تہنیت ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں وہ بنیادی نکتہ جسے میں اکثر اپنے درس میں بیان کیا کرتا ہوں، اُسے آج پھر دُہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ قرآن کی تعلیم صرف نہاں خانۂ ذہن میں محفوظ کر لینے کے لئے نہیں۔ اس کا صحیح مقام، قلبِ انسانی کی گہرائیاں ہیں۔ اس لئے کہ ذہنی سطح پہ تیرنے والی تعلیم، ایک قسم کا فکری نشاط تو پیدا کر سکتی ہے، انسان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک انسان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا نہ ہو، جب تک اس کی اقدار کے پیمانے نہ بدلیں، اس کی سیرت و کردار میں حُسن پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان

بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اور جب اس طرح قلب و نگاہ مسلمان ہو جائے تو پھر، قرآن کے الفاظ میں، یہ زمین بدل جاتی ہے، یہ آسمان بدل جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں جس طرح آج سے چودہ سو سال پہلے یہ صلاحیت تھی کہ وہ اس جہانِ متعفّن کو بدل کر، اس کی جگہ ایک نئی دُنیا وجود میں لے آئے، اس میں آج بھی اس کی صلاحیت بدستور موجود ہے، اس لئے کہ قانونِ کائنات نہ کبھی پُرانا ہوتا ہے نہ فرسودہ قرآن آج بھی یہ کچھ کر کے دکھا سکتا ہے کہ ؎

گر زمینی، آسماں سازد ترا   آنچہ حق میخواہد، آں سازد ترا
خستہ باشی! استوارت می کند   پختہ مثلِ کوہسارت می کند
نوعِ انساں را پیامِ آخریں   حاملِ اُو رحمۃ للعالمینؐ

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ (۱۷/۹)

آخر میں، مَیں اس سلسلۂ دراز کی تکمیل پر ایک بار پھر حضور ربّ العزت سجدہ ریز ہوں کہ اس نے مجھے ان صبر آزما مراحل کو بحسن و خوبی طے کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اور اس کے ساتھ ہی بصد عجز و نیاز عرض پرداز ہوں کہ اس درس میں مَیں نے جو کچھ قرآن کی منشاء کے مطابق پیش کیا ہے، وہ اسے ثبات و استحکام عطا کرے اور اگر کوئی بات نادانستہ، منشائے قرآنی کے خلاف کہہ دی گئی ہو، تو اسے محو کر دے۔ اقبالؒ کی ہمنوائی میں میری دعا یہ ہے کہ ؎

گر دلم آئینہ بے جوہر است   در بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن   ایں خیاباں را ز خارم پاک کن!

اور

گر دُرِ اسرارِ قرآں سُفتہ ام   با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تر گرداں مرا   آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

والسّلام علیکم!

درسِ دوم ــــ آغازِ دورۂ ثانی۔ (مارچ ۱۹۶۶ء) جو اب تک جوئے نور کی طرح رواں دواں جاری ہے۔

عزیزانِ گرامی قدر! سلام مسنون۔

آپ کو، درسِ قرآنِ کریم کے سلسلۂ زریں کا آغازِ نو مبارک ہو۔ کس قدر ثریا بخت ہیں وہ محفلیں جن میں خدا کی اس

کتاب جلیل و عظیم کا تذکرہ جیسا دہ جو کشادِ قلب و نگاہ ہو۔ دعا ہے کہ خدا آپ احباب کے اس پاکیزہ ذوق میں برکت عطا فرمائے۔

جیسا کہ میں نے درس کے سابقہ سلسلہ کے اختتام پر عرض کیا تھا، میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں۔ اس سے زیادہ نہ میری کوئی پوزیشن ہے نہ کوئی دعوے۔ میں نے عمر بھر اس کتاب عظیم کو اپنی نگاہوں میں رکھا ہے۔ اور ایسا کہنے میں، میں کسی مبالغہ سے کام نہیں لے رہا۔ قریب پانچ برس کا تھا کہ مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ اس وقت سے آج تک — کہ میری عمر پچھتر برس[1] کے قریب ہونے کو آئی ہے — بجز ان دنوں کے جن میں کسی وجہ سے معذور ہی نہ ہو گیا ہوں، شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو جب قرآن مجید میرے سامنے کھلا نہ ہو۔ عمر کے پہلے مرحلہ میں، قرآن کا مطالعہ اسی قدیم انداز سے کیا جیسا ہمارے ہاں ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے بعد جب میرے شعور نے آنکھ کھولی تو یہ دیکھا کہ اس طریق سے، جو کچھ قرآن سے سمجھا تھا وہ حقیقت سے بہت دُور تھا۔ اس کے بعد میں نے قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کی کوشش، اور میں از راہِ فخر یہ نہیں، بلکہ بطور تحدیثِ نعمت یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ قرآن کریم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کی صداقت پر مجھے علیٰ وجہ البصیرت، قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، یقین نہ حاصل ہو۔ فالحمد للہ حمداً کثیرا۔ قرآن حکیم کو اس طرح سمجھ لینے کے بعد، مجھ پر یہ فریضہ عائد ہو گیا کہ — دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دوں۔ چنانچہ قریب تیس[2] سال سے مسلسل، میں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں، اپنی بساط کے مطابق، مصروف تگ و تاز ہوں۔ میرا ہفتہ واری درس، اسی پروگرام کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس سلسلہ کو میں نے (غالباً) ۱۹۵۳ء میں کراچی میں شروع کیا تھا۔ (اس سے پہلے دہلی اور شملہ میں متفرق خطابات کے ذریعہ اس فریضہ کو سرانجام دیتا رہا)۔ اور یہ سلسلہ بعونہٖ تعالیٰ، آج تک جاری ہے۔ درس کا پہلا سلسلہ، آٹھ سال کے بعد، گذشتہ دسمبر میں تکمیل تک پہنچ گیا تھا۔ اس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ اس گراں بار ذمہ داری سے میں سبکدوش ہو گیا ہوں، لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ؎

مکتبِ عشق کا انداز نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

اربابِ شوق کے اصرارِ پیہم کے پیشِ نظر، اس سلسلہ کو از سرِ نو شروع کرنا پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سفر میں کوئی مقام بھی ایسا نہیں آ سکتا جسے آخری منزل کہا جا سکے۔ ان وادیوں میں تو ہاتفِ ردا، رہروؤں کو پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ ؎

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلسلۂ نو کا آغاز ہم بہار کے موسم سے کر رہے ہیں جب حیاتِ تازہ اپنی نمود کے لئے

---

[1] اب اسی برس

[2] اب پچاس سال

مضطرب و بے قرار ہوتی ہے اور شاخوں کے پردوں میں چھپی ہوئی رعنائیاں، مستانہ وار ابھر اور نکھر کر وجہ شادابیٔ عالم بن جاتی ہیں۔ چہ عجب کہ وہ قرآنی حقائق جو سلسلۂ اول میں ہماری نگاہوں سے پوشیدہ رہ گئے تھے۔ اس دفعہ بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آجائیں۔

سلسلۂ اول میں، میرا انداز زیادہ خطیبانہ تھا لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ درس کا اسلوب معلمانہ رکھوں۔ اور قرآن کریم کو ایک نصاب کی کتاب کی طرح آپ احباب کے سامنے پیش کروں۔ یعنی اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح کرتے ہوئے متعلقہ آیت کا مفہوم متعین کر دیا جائے اور پھر اس آیت کا ربط دیگر آیات کے ساتھ قائم کرتے ہوئے قدم بقدم آگے بڑھتے چلے جائیں۔ ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷/۵) میں اس شوقِ بے پایاں اور آرزوئے بیکراں کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ؎

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ

لفظ قرآن کا مفہوم

لفظ قرآن کا مادہ (ق - ر - ء) ہے۔ عربی زبان میں مادہ کسے کہتے ہیں اور اس کی خصوصیت کیا ہوتی ہے، اس کے متعلق ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ اس مادہ (ق - ر - ء) کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ــــ جمع کرنا اور محفوظ رکھنا ــــ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "جمع" اور "حفظ" بھی تو عربی زبان کے الفاظ ہیں اور خود قرآن نے انہیں استعمال بھی کیا ہے تو پھر (ق - ر - ء) کے مادہ میں کیا خصوصیت ہے کہ قرآن کا لفظ، اس مادہ سے لیا گیا، جمع اور حفظ سے نہیں۔ قرآن کا ایک اعجاز لفظوں کا انتخاب ہے، اور اس کا یہ انتخاب خود پکار کر کہہ دیتا ہے کہ

این کتابے نیست چیزے دیگر است

(ق - ر - ء) کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اس طرح جمع اور محفوظ رکھنا جس طرح رحمِ مادر میں نطفہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رحم میں نطفہ اس طرح محفوظ نہیں رکھا جاتا جس طرح (مثلاً) کسی تھیلی میں چند سکے محفوظ رکھے ہوں۔ وہ سکے، جامد ہوں گے اور ویسے کے ویسے پڑے رہیں گے۔ لیکن رحم میں نطفہ جامد نہیں ہوتا۔ اس میں بڑھنے، پھولنے، پھلنے، نشوونما پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ قرآن کریم تمام نوعِ انسان کے لئے، قیامت تک ضابطۂ حیات ہے۔ اس لئے اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہئے (اور ہے) کہ یہ انسانی زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے چلا جائے۔ یہ ہر زمانے میں انسانی فکر کی امامت کا فریضہ سرانجام دے۔ یہ کاروانِ انسانیت کے لئے ہر منزل میں چراغِ راہ ہو۔ یہ کسی مقام پر بھی یہ نہ کہہ دے کہ مجھ میں اب آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ خصوصیت اسی ضابطۂ ہدایت کو حاصل ہو سکتی ہے جس کے حقائق میں، علمِ انسانی کی نسبت سے بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی صلاحیت ہو۔ یہ حقیقت ہے جسے قرآن نے ان حسین و بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ (۴۱/۵۳)

ہم نوعِ انسان کو اپنی نشانیاں عالم انفس و آفاق میں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ حق و صداقت پر مبنی ہے۔

یعنی جوں جوں انفس و آفاق میں پوشیدہ حقیقتیں بے نقاب ہوتی جائیں گی قرآن کی صداقت اور نکھر اور ابھر کر سامنے آتی جائے گی۔ انسانی علم کی ہر تحقیق۔ سائنس کا ہر انکشاف قرآنی دعاوی کی شہادت بنتا چلا جائے گا۔ دوسرے مقام پر اس نے کہا ہے کہ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ۔ چونکہ یہ عالمگیر انسانیت کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس لئے وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ۝ (۳۸/۸۸) ۔ اس میں بیان کردہ حقائق سب کے سب ایک ہی وقت میں سامنے نہیں آجائیں گے۔ یہ کچھ وقت کے بعد بے نقاب ہوں گے۔

یہ ہے لفظ قرآن کی، مادہ کے اعتبار سے خصوصیت۔ بعض ماہرینِ لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے اور اس کے معنی ہیں اعلانِ عام (PROCLAMATION) اس اعتبار سے قرآن کے معنی ہوں گے مملکتِ خداوندی کا اعلامیہ۔ وہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۔ تو اس کے معنی ہوں گے ۔۔۔ اُٹھ ۔۔۔ اور دُنیا میں اس خدا کی عالمگیر ربوبیت کا اعلان عام کر دے جس نے کائنات اور انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اس حقیقت کا اعلان کہ انسانوں کی ربوبیت (پرورش) انسانوں کے ہاتھ میں نہیں رہے گی۔ یہ اس خدا کے نظام کی تحویل میں رہے گی جس نے انسانوں کو پیدا کیا اور ان کی نشوونما کا ذمہ لیا ہے۔

کیسا انقلاب آفریں ہے خدا کا یہ اعلان!

کتاب خدا نے قرآن کو کتاب بھی کہا ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ک۔ ت۔ ب) ہے جس کے معنی حکم دینے یا کسی بات کو واجب قرار دینے کے ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ۔ (تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں)۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ ۔ تم پر (عند الضرورت) جنگ کرنا قانوناً لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے "کتاب" کے معنی ضابطۂ قانون کے ہوں گے۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو ان معانی میں خود استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۃ النساء میں پہلے تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے کون کون سے رشتے تم پر حرام ہیں۔ اور اس کے بعد کہا كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (۴/۲۴) تمہارے لئے خدا کا قانون ہے۔ اسی جہت سے قرآن کے متعلق کہا کہ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۔ (۹۸/۳) اس میں نہایت محکم قوانین ہیں۔

قوانینِ فطرت اس مقام پر ضمناً ایک نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ دُنیا میں قوانین (LAWS) دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے وہ جن کا تعلق خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی تمدنی زندگی سے ہوتا ہے۔ قوانینِ فطرت کے متعلق ہر صاحبِ علم (سائنٹسٹ) اس کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں۔ لیکن جہاں تک دوسری قسم کے قوانین کا تعلق ہے، مغرب کے سیکولر نظام کی عمارت

اس مفروضہ پر استوار ہوتی ہے کہ انسانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ان قوانین کو خود وضع کریں لیکن قرآن کا دعوے یہ ہے کہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے تحت انسانی معاشرہ کو فوز و فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ ان قوانین کے بنیادی اصول اور مستقل اقدار بھی (قوانین فطرت کی طرح) خدا ہی کی طرف سے ملنے چاہئیں۔ یہ اصول و اقدار وحی کی رُو سے ملتے ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ قرآن کریم نے جہاں انسانی زندگی سے متعلق قوانین کو کتاب اللہ سے تعبیر کیا ہے، وہاں اس نے قوانینِ فطرت کے لئے بھی یہی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ میں ہے

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ..... (۹/۳۶)

یہ حقیقت ہے کہ کتاب اللہ کی رُو سے مہینوں کی تعداد بارہ ہے اور یہ اس زمانے سے مقرر ہے جب خدا نے ارض و سمٰوٰت کو پیدا کیا تھا۔ یعنی جتنی مدت میں زمین، سورج کے گرد پورا چکر کاٹتی ہے، وہ ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے اور اس کو بارہ پر تقسیم کر کے مہینوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ اس تقسیم کی رُو سے ہر سال کا ہر مہینہ، سابقہ سال کے اس مہینہ کے مطابق ہوتا ہے[1]۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں بات ہو رہی تھی قانونِ فطرت کی۔ لیکن اسے تعبیر کیا گیا ہے "کتاب اللہ" سے۔ اس کے بعد ہے فِيهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ۔ ان میں سے چار مہینے ایسے ہیں جن میں جنگ ممنوع قرار دی گئی ہے ـــــ یہ قانون، انسانی معاشرہ سے متعلق ہے۔ اس کے بعد ہے ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (۹/۳۶)۔ یہ خدا کا دینِ قیم ہے۔ یعنی قوانینِ فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق قوانین، دونوں کے مجموعہ کا نام دینِ قیم ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "کتاب اللہ" کے دو حصے ہیں۔ ایک صحیفۂ فطرت، جو خارجی کائنات میں بکھرا پڑا ہے۔ اور دوسرا صحیفۂ وحی، جس کا محفوظ اور مکمل مجموعہ قرآن کریم ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے، یہ دونوں قوانین، خدا کی طرف سے عطا کردہ ہیں اور دونوں کی پابندی ضروری ہے۔ قوانین فطرت کی پابندی سے فطرت کی قوتیں مسخر ہو جاتی ہیں۔ اور قوانین وحی کی پابندی سے وہ قوتیں انسانی ذات کی نشوونما اور عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک ضابطۂ قوانین سے بھی اعراض برتا جائے تو زندگی کا اعتدال قائم نہیں رہتا اور کاروانِ انسانیت منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر قوانین فطرت سے اعراض برتا جائے تو دین، مذہب میں تبدیل ہو کر خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (دنیا میں ذلت و خواری) کا موجب بن جاتا ہے۔ اگر مستقل اقدار خداوندی سے اعراض برتا جائے تو دنیا اُس جہنم میں گرفتار ہو جاتی ہے جس کے شعلے آج تمام اقوامِ عالم کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ اس روشِ زندگی کو قرآن نے "کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ کیا یہ لوگ کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہیں؟

---

[1] قرآن میں اس کی وضاحت کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ اس کی بابت متعلقہ مقام پر تفصیل سے بات کی جائے گی۔

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) جو ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ دنیا کی زندگی میں ذلت و خواری اس کے حصے میں آئے گی۔ اور قیامت میں وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو گا۔ تاریخ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ تسخیرِ فطرت اور مستقل اقدار کو جب بھی الگ الگ رکھا گیا اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ انسانی

کتاب میں تفریق

زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اسے مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب میں تفریق کا ایک پہلو تو یہ ہے جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔۔۔ یعنی قوانینِ فطرت اور مستقل اقدار میں مغائرت پیدا کرنا۔ دوسرا گوشہ یہ ہے کہ خود قرآن کریم کے ایک حصہ پر عمل کرنا اور دوسرے سے اعراض برتنا۔ اس کا نتیجہ بھی ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہم نے صدیوں سے یہی روش اختیار کر رکھی ہے اور اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں (مثال کے طور پر دیکھئے) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ اور كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ دونوں یکساں احکام خداوندی ہیں۔ لیکن ہم كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ پر تو اس شدت سے عمل پیرا ہوتے ہیں لیکن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ کو اپنی زندگی سے یکسر خارج کر رکھا ہے، حالانکہ مومن کی ساری زندگی مجاہدانہ عسکریت کی زندگی تھی۔ روزوں پر زور اور عسکری تربیت سے اجتناب! یہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر کے مرادف نہیں تو اور کیا ہے۔

الحاد

اتنا ہی نہیں کہ کتاب کے ایک حصہ پر عمل اور دوسرے سے مجرمانہ تغافل! قرآن تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ کسی ایک قانون یا صفتِ خداوندی کی پابندی میں اس قدر شدت اختیار کر لینا کہ اس سے دوسرے قوانین یا صفاتِ الٰہیہ نظر انداز ہو جائیں، اس کا نتیجہ بھی خوش گوار نہیں نکل سکتا۔ ایک جگہ اس نے کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا (۴۱/۴۰) جو لوگ ہمارے قوانین میں ایک طرف نکل گئے، ان کی یہ روش ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ دوسرے مقام پر ہے وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (۷/۱۸۰)۔ جو لوگ صفاتِ خداوندی میں سے کسی ایک صفت کو لے کر اس میں ایک طرف دور تک نکل جائیں، ان سے تم کنارہ کشی اختیار کرو۔ (مثال کے طور پر) یہودی اور ہندو، خدا کی صفتِ عدل میں اس قدر متشدد ہو گئے کہ انہوں نے لغزش خوردہ انسان کے لئے بازآفرینی کا کوئی دروازہ ہی کھلا نہ رہنے دیا۔ دوسری طرف عیسائیت، اس کی صفتِ رحیمیت میں اس قدر متشدد ہو گئی کہ اس نے زندگی سے عمل کو یکسر خارج کر دیا اور ہر بات کو خدا کے رحم اور (GRACE) پر منحصر قرار دے دیا۔ قرآن کی رُو سے وہ روش بھی غلط تھی اور یہ بھی غلط۔ صحیح روش وہی ہے جو ان قوانین و صفات کی پابندی میں صحیح تناسب و توازن بدوش ہو۔ اسی کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔ اسلام، الاسماء الحسنیٰ مختلف صفاتِ خداوندی کو پورا پورا توازن لئے ہوئے اعلیٰ حد بشریت اپنے اندر منعکس کرنے اور عملی زندگی میں انہیں معیار قرار دینے کا نام ہے۔

اس وقت میں صرف انہی اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔ تفصیل اس اجمال کی اپنی اپنی جگہ آپ کے سامنے آتی جائے گی۔

یہ کتاب ہے

قرآن کریم کو کتاب کہنے سے اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانا بھی مقصود تھا

کہ یہ ایک کتاب ہے، اور جس طرح تم کسی کتاب کو پڑھتے ہو اور اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہو، اُسی طرح اسے بھی پڑھو اور اس سے مستفید ہو۔ آپ سوچئے کہ اگر آپ کو کوئی ایسی کتاب دے دی جائے، جس کی زبان سے آپ ناواقف ہوں تو آپ اُس کتاب کو کبھی نہیں پڑھتے۔ حتیٰ کہ اگر اُس کی زبان مشکل ہو تو بھی آپ اس کے دو چار صفحے پڑھ کر الگ رکھ دیتے ہیں، کہ اس کا معیار میری علمی سطح سے اونچا ہے۔ اگر اُس کتاب کا پڑھنا آپ کے لئے ضروری ہے تو آپ اُس کی زبان سیکھتے ہیں اور اپنے اندر اتنی استعداد پیدا کرتے ہیں جس سے وہ کتاب سمجھ میں آجائے، آپ کبھی یہ نہیں کرتے کہ آپ کتاب پڑھتے جائیں، خواہ وہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ دُنیا کی کسی کتاب کے ساتھ آپ یہ نہیں کرتے۔ لیکن اس میں ایک استثناء ہے اور وہ ہے قرآن کریم۔ اس کے متعلق یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ اس کی زبان آتی ہو یا نہ آتی ہو، اسے پڑھتے رہنا چاہئے۔ اس سے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دُنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جسے اس شدت اور کثرت سے پڑھا جاتا ہو، اور اس کے ساتھ ہی، دُنیا کی کوئی اور کتاب ایسی نہیں جسے بے سمجھے پڑھا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن سے دُور رکھنے کے لئے۔ یا یوں کہئے کہ قرآن کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لئے۔ یہ ایک بڑی گہری سازش تھی۔ جسے تقدیس کا لباس پہنا کر مؤثر بنا دیا گیا۔ یوں قرآن کتاب نہ رہا، جنتر منتر کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ کتاب اور جنتر منتر میں فرق یہ ہوتا ہے کہ کتاب کے الفاظ سمجھ کر پڑھے جاتے ہیں اور جنتر منتر کے الفاظ بلا سمجھے دُہرائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ قرآن کے الفاظ کے تعویذ لکھے جانے لگے۔ اس کی آیات کے ورد ہونے لگے اور اس کا نام رکھا گیا "اعمالِ قرآنی" اور ایسا کرنے والا کہلانے لگا "عامل"۔ سوچئے کہ ہم اس کتاب کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ یاد رکھئے جب تک مسلمان قرآن کو کتاب نہیں سمجھتا وہ اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

مدوّن کتاب

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کے شروع میں یہ کہہ دیا تھا کہ قرآن ایک کتاب ہے۔ عربوں کے ہاں کتاب کا لفظ اس وقت بولتے تھے جب منتشر اجزاء کی شیرازہ بندی کر کے ان میں لوہے کا کڑا پرو دیا جاتا تھا یا سلائی کر دی جاتی تھی ـــــ قرآن کو الکتاب کہنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صحیفۂ مقدسہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں ایک مرتب اور مدوّن کتاب کی شکل میں موجود تھا، جس کی شیرازہ بندی بھی ہو چکی تھی۔ سورۃ الطور میں ہے

وَالطُّوْرِ ۙ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ (۵۲/۱-۳)

یعنی قرآن سطروں میں لکھی ہوئی کتاب تھی۔ پہلے اسے منتشر اوراق پر لکھا جاتا تھا اور بعد میں اس کی شیرازہ بندی کی جاتی تھی۔ عربوں کے ہاں ہرن کی کھال چھیل کر اُسے (PARCHMENT) کی شکل میں قرطاس بنا لیتے، اسے رَقّ کہتے تھے جن تحریروں کو محفوظ رکھنا مقصود ہوتا، انہیں اس پر قلم بند کر لیتے تھے۔ جہاں تک کاتبینِ وحی کا تعلق ہے، سورۂ عبس میں ہے کہ قرآن کی کتابت بڑے باعزت اور قابلِ اعتماد کاتبوں نے کی تھی (۸۰/۱۵-۱۶)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں قرآن جمع اور مدوّن نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تدوین بعد میں (منتشر ٹھیکروں، ہڈیوں اور پتوں) کی مدد سے حضرت

ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوئی تھی، ذہن میں جنہیں قرآن کی اہمیت اور خصوصیت کو نظروں سے گرانے کے لئے اختراع کیا گیا۔

مکمل و محفوظ

اسی مرتّب اور مدوّن کتاب کے متعلق کہہ دیا گیا کہ یہ کتاب مکمل ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵)۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ خدا نے اسے نازل کیا ہے اور وہ خود اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ؁ (۱۵/۹) یعنی خدا نے اس کی تصریح فرما دی کہ

(۱) قرآن کریم ایک مرتب کتاب کی شکل میں رسول اللہ کے زمانے میں موجود تھا۔

(۲) یہ ہر طرح سے مکمّل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔

(۳) یہ قیامت تک کے لئے محفوظ رہے گا۔

ختمِ نبوّت

اس سے آپ، علاوہ دیگر امور، اس حقیقت کو بھی دیکھ لیں کہ قرآن کریم نے ختمِ نبوّت کی حقیقت کو کس طرح واضح کر دیا ہے۔ جب ایک ایسا ضابطہ حیات، ایسا جو تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک کے لئے مرتّب اور محفوظ شکل میں دے دیا گیا ہو اور اس کے بعد اس میں کوئی تبدیلی بھی نہ کر سکتا ہو، تو ایسی کتاب کی موجودگی میں کسی نبی یا رسول کے آنے کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے۔ قرآن کی ابدیت، اکملیت، محفوظیت اور عالمگیریت خود ختمِ نبوّت کی دلیل ہے۔ قرآن کی نص صریح کی رُو سے کوئی نبی یا رسول بغیر کتاب کے نہیں آیا۔ لہٰذا جب خدا کی طرف سے آخری کتاب دی جائے تو اس کا لانے والا خود بخود آخری رسول ہو جائے گا۔

زبانِ عربی

قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (۲۶/۱۹۵)۔ اس کتاب کی زبان عربی مبین ہے۔ خود لفظ "عربی" کے معنی بھی فصیح اور واضح کے ہیں۔ اور جب اس کے ساتھ "مبین" کا اضافہ کر دیا جائے تو اس کے واضح تر ہونے میں شبہ کیا رہ جاتا ہے؟ یہ کتاب واضح ہے اور غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (۳۹/۲۸)۔ اس میں کوئی پیچ و خم نہیں، ابہام نہیں، التباس نہیں —— صاف، نکھری، سیدھی، واضح، کتاب روشن حتیٰ کہ قرآن کو نُور بھی کہا گیا ہے یعنی خود روشن اور دُنیا کو روشن کرنے والی کتاب۔

یوں تو قرآن کی زبان، عربی کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ خدا نے اصول یہ بتایا ہے کہ جس قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جاتا ہے، اس رسول کا پیغام اُسی قوم کی زبان میں ہوتا ہے۔ چونکہ رسول اللہ کے اوّلین مخاطب عرب تھے، اس لئے قرآن انہی کی زبان میں آیا۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مشیت کا پروگرام کچھ ایسا تھا کہ وہ زبان جس میں قرآن نازل ہونا تھا ایسی جامع، عمیق اور وسیع ہو کہ وہ قرآنی حقائق کی متحمل ہو سکے۔ علم الالسنہ کے ماہرین بتاتے ہیں کہ اس باب میں دنیا کی کوئی زبان عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے (حضرت اسمٰعیلؑ) کو ذبح کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تو خدا نے انہیں، بیٹے کے حلق پر چھُری چلانے سے روک دیا اور کہا کہ ہم اسے ایک عظیم قربانی کے لئے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے تھے اور باپ کی مملکتِ عظیم کا انہی کو وارث

ہونا تھا۔ لیکن حکم یہ دیا گیا کہ انہیں حجاز کی وادیٔ غیر ذی زرع میں بسا دیا جائے تاکہ وہ وہاں خانۂ خدا کی تولیت کا فریضہ سرانجام دیں۔ اور مملکتِ شام کی سرداری حضرت اسحاقؑ کو دے دی جائے۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اسحاقؑ کی اولاد (بنی اسرائیل) امورِ جہانبانی میں مصروف رہی۔ اس کے حصے میں شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی آئی۔ لیکن بنی اسماعیلؑ اسی وادیٔ غیر ذی زرع میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے رہے۔ انہوں نے نہ کوئی حکومت قائم کی اور نہ ہی کسی تہذیب و تمدن کی بنا ڈالی۔ یہ ایک ہی کام کرتے رہے یعنی عربی زبان کی تشکیل، تعمیر اور تہذیب۔ انہوں نے اس زبان کو اس مقام پہ پہنچا دیا کہ دنیا کی کوئی زبان اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ ڈاکٹر (BUCKE) نے اپنی کتاب (COSMIC CONSCIOUSNESS) میں مشہور مستشرق (MAX MULER) کی تحقیقات کے حوالے سے لکھا ہے جس زمانے میں تمام انڈو یورپین زبانوں میں بنیادی تصورات (ROOT CONCEPTS) کی تعداد ایک سو اکیس تک پہنچی تھی، عربوں کے ہاں صرف اونٹ کے متعلقات میں پانچ ہزار سات سو چوالیس (۵۷۴۴) الفاظ موجود تھے۔ اس سے اس زبان کی وسعتوں کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ یہ بڑی سائنٹیفک زبان ہے۔ اس میں ایک مادہ (ROOT) ہوتا ہے جو عام طور پہ تین حرفوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس مادے کے معانی میں ایک بنیادی خصوصیت ہوتی ہے جو ان تمام الفاظ میں جھلکتی چلی جاتی ہے جو اس مادے سے مختلف ابواب میں بنائے جاتے ہیں۔ ان مادوں کی تعداد (۲۵۰۰) کے قریب ہے۔ آپ اندازہ کر لیجئے کہ ان مادوں سے جو الفاظ بنائے گئے ہوں گے ان کی تعداد کس قدر ہوگی؟

یہ تھی وہ زبان جس میں قرآن نازل ہوا، چونکہ یہ بڑی سائنٹیفک واقع ہوئی ہے اس لئے اس کا سیکھنا بڑا آسان ہے۔ یہ جو اس زبان کو ہوّا بنا کر رکھ دیا گیا ہے تو یہ بھی ایک سازش ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عام مسلمان قرآن کو براہِ راست سمجھنے سے رُک جائیں اور یہ خاص طبقے کی اجارہ داری ہے۔ خود قرآن کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ (۵۴/۱۷)

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے بڑا آسان بنایا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۴۱/۳) یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات کو نکھار کر الگ الگ کر کے واضح طور پہ بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ قرآن ان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں ایک واضح ضابطۂ حیات بن گیا۔ یہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹) ہے۔ یعنی جن امور کا ذکر اس میں کیا گیا ہے انہیں بڑی وضاحت سے کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

تصریفِ آیات

قرآن کے نازل کرنے والے خدا نے کہا ہے کہ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (۷۵/۱۹) قرآن کی وضاحت خود ہمارے ذمہ ہے۔ اس کے لئے طریق کیا اختیار کیا گیا ہے، یہ بات غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قرآن کا انداز عام کتابوں جیسا نہیں۔ عام کتابوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ان میں کتاب مختلف ابواب میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ہر باب کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے اور اس موضوع سے متعلق تعلیم اس باب کے تحت مربوط طور پہ دے دی جاتی ہے۔ قرآن اس طرح کی تصنیف کردہ کتاب نہیں۔ وہ یوں سمجھئے جیسے تئیس سال میں ارشاد فرمودہ مختلف خطبات کا مجموعہ ہو۔ اس میں ایک بات ایک مقام پہ آئی ہے

اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام پر ہے۔ تفصیل کسی اور جگہ ہے۔ استثناء کسی اور سورۃ میں۔ نیز مختلف حقائق کو مختلف واقعات کے ضمن میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اسے تصریف آیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانا۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۱۰۵)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن میں مختلف آیات کو پھیر پھیر کر اس لئے لایا گیا ہے کہ بات اس طرح واضح ہو جائے۔ جیسے چھلکا اور مغز الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور یوں بات نکھر اور ابھر کر سامنے آجائے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔

(۱) محاورۂ عرب۔ یعنی نزول قرآن کے زمانے میں عربی زبان کے ان الفاظ کا جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں جو مفہوم عرب لیتے تھے۔ اس سے واقفیت اور

(۲) قرآن پر اتنا عبور کہ جو بات کسی ایک آیت میں کہی گئی ہے، یہ چیز بیک وقت آپ کے سامنے آجائے کہ اس کے متعلق قرآن کے دیگر مقامات میں کیا آیا ہے۔

تدبر فی القرآن

لیکن ان دونوں شرطوں سے زیادہ اہم ایک اور شرط بھی ہے اور وہ ہے تدبر فی القرآن (۴/۸۲)۔ یعنی قرآن کو سمجھنے میں غور و فکر سے کام لینا۔ آپ قرآن کریم کے ورق الٹیئے۔ قریب قریب ہر صفحے پر آپ کو علم و بصیرت اور عقل و شعور سے کام لینے اور غور و فکر کرنے کی تاکید ملے گی۔ تدبر کا حکم نہ کسی خاص فرد کے لئے ہے نہ کسی خاص زمانے کے لئے۔ وہ تمام افراد کے لئے ہے اور تمام زمانوں کے لئے۔ اس لئے قرآن کو تقلیداً سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ وہی کسی ایک فرد کا تدبر و تفکر دوسرے کے لئے سند اور حجت ہو سکتا ہے۔ قرآن پر غور کرنے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے زمانے میں جس سطح تک علم انسانی پہنچ چکا ہے، اس پر اس کی نگاہ ہو۔ قرآن انسانی زندگی کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہی معلوم نہ ہو کہ انسان کے زمانے کے انسانی تقاضے کیا ہیں تو وہ قرآن سے مراد تعالیٰ کیا حاصل کر سکے گا؟ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جس طرح ایک فرد کا تدبر فی القرآن دوسرے کے لئے سند اور حجت نہیں ہو سکتا، اسی طرح جو کچھ قرآن کے متعلق کسی ایک زمانے میں سمجھا گیا ہو وہ بھی حرفِ آخر نہیں ہو سکتا۔ جوں جوں علم انسانی بڑھتا جائے گا، نت نئے قرآنی حقائق واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں

قرآن میں ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (۴/۸۲)۔ کیا ان لوگوں نے قرآن میں تدبر نہیں کیا۔ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں کئی اختلاف پاتے۔ یعنی قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کہیں اختلاف نہیں۔ اور یہ چیز اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کے الفاظ میں تو کوئی اختلاف نہیں لیکن اس کی تعبیرات (INTERPRETATIONS) مختلف ہو سکتی ہیں۔ آپ سوچئے کہ لفظی اختلافات کا نہ ہونا بھی کوئی ایسی خصوصیت ہے جس کا اس تمدی سے ذکر

کیا جاتا؟ ساری بات تو تعبیرات کی ہے۔ اگر کسی کتاب کی عبارت کی کیفیت یہ ہو کہ وہ زید کو کوئی مفہوم دے اور بکر کو اس سے بالکل متضاد مفہوم، تو کیا اہلِ علم کے نزدیک اس کتاب کی کوئی وقعت ہو سکتی ہے؟ قرآن سمجھنے کے لئے جو شرائط قرآن نے مقرر کی ہیں، اگر اُن کے مطابق قرآن میں تدبّر کیا جائے تو اس کے کسی حکم کی دو تعبیریں ہو ہی نہیں سکتیں۔

اس مقام پر ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآن کریم میں کچھ تو احکام و قوانین دیئے گئے ہیں اور کچھ حقائق — احکام و قوانین کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کے معانی متعین اور ٹھوس (CONCRETE) ہیں۔ لیکن حقائق — بالخصوص وہ حقائق جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے — انہیں تشبیہات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اہلِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ تشبیہات و استعارات سے ہر شخص اپنے اپنے فہم اور علمی سطح کے مطابق مشبہ بہ کے متعلق تصور قائم کر سکتا ہے۔ ان تصوّرات میں اختلاف ہوگا۔ لیکن جہاں تک قرآنی ہدایات کا تعلق ہے ان کی دو تعبیریں نہیں ہو سکتیں۔ یہ احکام و قوانین اسلامی نظام کی طرف سے نافذ ہوں گے، اس لئے ان کی عملی جزئیات میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ یوں اُمّت میں وحدتِ فی العمل پیدا ہو جائے گی۔ اور قرآنی حقائق سمجھنے کے لئے فکری آزادی بھی برقرار رہے گی۔

تطہیرِ فکر و نظر

لیکن ان تمام شرائط سے کہیں زیادہ گہری شرط ایک اور ہے اور وہ یہ کہ جب تک اپنے ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات، معتقدات اور تصوّرات سے پاک نہیں کر لیا جائے گا، قرآن سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ (۵۶/۷۹)، قرآن کا واضح ارشاد ہے۔ یعنی جس کے قلب و نگاہ، انسانی خیالات کی آمیزشوں سے پاک نہ ہوں اسے قرآن سے کوئی مس نہیں ہو سکتا۔ انسانی قلب خدا کا مسکن بن نہیں سکتا جب تک اس حریمِ کعبہ سے انسانی فکر کے تراشیدہ بتوں کو نکال باہر نہ کیا جائے جو شخص پہلے سے کوئی خیال قائم کر کے قرآن کی طرف اس لئے آتا ہے کہ اُسے اپنے اس خیال کی (کسی نہ کسی طرح) تائید مل جائے، اُسے قرآن کی بارگاہ سے بُری طرح پھٹکار پڑتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہئے

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اہلِ عرب کی زبان تو عربی ہے، وہ بھی قرآن کو صحیح طور پر کیوں نہیں سمجھ پاتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی قرآن کو (غیر عرب مسلمانوں کی طرح) تقلیداً سمجھتے ہیں۔ یعنی کسی زمانے میں کسی مفسّر نے جس طرح قرآن کو سمجھا، وہ آنے والوں کے لئے سند اور حجت بن گیا۔ اُس کے بعد یہ سوال ہی نہ رہا کہ قرآن میں خود غور و فکر کیا جائے۔ یہ تقلیدی قرآن، عربوں کو عربی زبان میں پڑھایا جاتا ہے اور غیر عربوں کو ترجموں کے ذریعے اُن کی اپنی زبان میں۔ اپنی فکر سے نہ یہ قرآن کو سمجھتے ہیں نہ وہ — اس لئے اس باب میں عرب اور عجم کی کوئی تفریق ہی نہیں رہی۔ تفسیر کی جو کتابیں الازہر میں پڑھائی جاتی ہیں وہی دیوبند (یا اب کراچی ملتان اور لاہور کے دارالعلوموں) میں زیرِ تدریس رہتی ہیں۔ اپنی فکر و بصیرت نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ قرآن

سمجھنے کے سوال اہلِ زبان ہونے کا نہیں، سوال زبان دانی کے بعد اہلِ فکر و نظر ہونے کا ہے۔

(۲)

احادیث کی رو سے قرآن فہمی

کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کریم کو احادیث کی مدد کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا کیونکہ رسول اللہؐ قرآن کے بہترین اور اعلیٰ ترین مفسر تھے۔ (بظاہر) یہ بات بڑی معقول دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے کہ جب کسی آیت کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ رسول اللہؐ نے اس کی تفسیر یہ بیان فرمائی تھی تو وہ کون سا مسلمان ہے جو اس بات کو زبان تک نہ لائے تو ایک طرف، اس کا تصور تک بھی کر سکتا ہو کہ اس کی تفسیر رسول اللہؐ کی بیان فرمودہ تفسیر سے بہتر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی بیان فرمودہ تفسیر قرآنی کہیں موجود بھی ہے؟ احادیث کی کتابوں میں ایک باب تفسیرِ قرآن کا بھی ہوتا ہے لیکن اس میں مختلف سورتوں کی دو دو چار چار آیتوں کی تفسیر ہوتی ہے اس سے زیادہ نہیں۔ ان احادیث کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ احادیث کی کتابوں میں تین قسم کی روایات قابلِ اعتماد نہیں ــــ پیش گوئیوں سے متعلق، لڑائیوں سے متعلق، تفسیر سے متعلق۔ اُن کے اس قول کی تصدیق خود اس تفسیر سے ہو جاتی ہے جسے کتب روایات میں رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً صحیح بخاری میں سورۂ بقرہ کی تفسیر کی ابتداء اس آیت سے ہوتی ہے، وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ۝ (اللہ نے آدم کو اشیاء کائنات کا علم عطا کر دیا) اور اس کی تفسیر حسبِ ذیل ہے:۔

> حضرت انس ابن مالکؓ۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن سب مسلمان جمع ہو کر مشورہ کریں گے کہ آج کے دن ہم کسی کو اپنا شفیع بنائیں اور آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ آپ سب کے باپ ہیں آپ کو اللہ نے ملائکہ سے سجدہ کرایا ہے اور آپ کو تمام نام سکھائے ہیں آپ ہماری شفاعت کریں تاکہ ہم آج اس تکلیف سے راحت پائیں وہ کہیں گے آج میں اس قابل نہیں اور اپنا گناہ یاد کریں گے (خلافِ حکم درخت کا پھل کھا لیا تھا) اور اللہ سے شرمائیں گے اور کہیں گے تم نوحؑ کے پاس جاؤ ان کو اللہ نے سب سے پہلا نبی بنا کر زمین پر بھیجا تھا۔ سب آدمی ان کے پاس آئیں گے وہ کہیں گے آج میں اس قابل نہیں اور اپنا گناہ یاد کر کے شرمائیں گے اور کہیں گے تم ابراہیمؑ خلیل اللہ کے پاس جاؤ سب کے سب ان کے پاس آئیں گے یہ بھی ایسے ہی کہیں گے اور کہیں گے تم موسیٰؑ کے پاس جاؤ اللہ نے ان سے باتیں کی ہیں اور توریت عطا فرمائی ہے وہ ان کے پاس آئیں گے یہ بھی کہیں گے میں آج کے دن تمہارا شفیع نہیں ہو سکتا اور اپنا گناہ یاد کر کے اللہ سے شرمائیں گے اور کہیں گے تم عیسیٰؑ کے پاس جاؤ وہ رسول اللہ اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں جب ان کے پاس آئیں گے یہ بھی ایسے ہی کہہ دیں گے اور کہیں گے محمدؐ کے پاس جاؤ جس کے اللہ نے اگلے پچھلے سارے گناہ بخش دیئے ہیں وہ اس وقت میرے پاس آئیں گے میں ان کو اللہ کے پاس بخشوانے لے جاؤں گا اور اللہ کے حضور میں (واعظہ کی) اجازت طلب کروں گا تو مجھ کو (آنے کی)

اجازت ملے گی تو جس وقت میں اپنے رب کو دیکھوں گا تو سجدے میں گر پڑوں گا اور اللہ جو بات میرے دل میں ڈالے گا وہ کہوں گا پھر (اللہ کی طرف سے) کہا جائے گا (اے محمدؐ) سر کو اٹھاؤ سوال کرو تاکہ عطا کیا جائے اور کہو تیرا سنا جائے گا اور شفاعت کرو قبول کی جائے گی۔ اس وقت میں سر اٹھاؤں گا اور جیسے اللہ نے مجھے تعلیم دی تھی ویسے ہی اس کی تعریف بجا لاؤں گا۔ پھر شفاعت کروں گا اس دفعہ ایک گروہ بخشا جائے گا۔ (یعنی مہاجرین اور انصار اور بڑے بڑے نیک بندے اولیاء اللہ، شہداء) اور ان کو جنت میں بھجوا دوں گا۔ پھر اللہ کی طرف آؤں گا اور دیکھ کر سجدے میں جاؤں گا اور شفاعت کروں گا۔ اس مرتبہ بھی ایک گروہ بخشا جائے گا۔ اسی طرح تیسری دفعہ پھر چوتھی دفعہ ایسے ہی شفاعت کروں گا۔ پھر اللہ کہوں گا کہ کوئی باقی نہیں رہا سوائے ان کے جن کو قرآن نے روکا ہے اور ان پر ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہنے کا حکم ہے۔ ابو عبد اللہ بخاری کہتے ہیں یعنی جن کے بارے میں یہ آیت (خَالِدِیْنَ فِیْهَا) ہے۔

آپ غور کیجئے کہ کیا اس تفسیر سے متعلقہ آیت کا کچھ مفہوم بھی سمجھ میں آتا ہے؟ یا اس کا اس سے کچھ بھی تعلق یا ربط ہے؟ کتبِ احادیث میں بیان کردہ تفسیر کا عام انداز یہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رسول اللہؐ کی انتہائی حکمت بالغہ تھی کہ حضورؐ نے اپنی احادیث کو خود مرتب کرا کر امت کو نہ دیا۔ حضورؐ بے شک اعلم الناس تھے لیکن آپؐ نے جو کچھ اپنے اوّلین مخاطبوں کو سمجھایا ہوگا وہ تو بہرحال اُس زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی ہوگا۔ اگر حضورؐ ان باتوں کو محفوظ کر کے امت کو دے دیتے تو بعد میں آنے والے تدبّر فی القرآن کا دروازہ بند ہو جاتا۔ اب جن باتوں کو احادیثِ رسول اللہؐ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت وہ باتیں ہیں جنہیں حضورؐ کی وفات کے دو تین سو سال بعد، بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے، لوگوں سے سن کر انفرادی طور پر جمع کیا گیا۔ یہ روایات منسوب الی الرسولؐ کہلا سکتی ہیں؛ احادیثِ رسول اللہؐ نہیں کہلا سکتیں۔ کیا معلوم ان میں کتنا کچھ حضورؐ کا اپنا ہے اور کتنا کچھ دوسروں کا ملایا ہوا ہے۔ احادیث کے مجموعوں کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان میں جو باتیں قرآن کے مطابق ہیں انہیں ہم صحیح تسلیم کر سکتے ہیں لیکن جو قرآن کے خلاف ہوں یا جن سے حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہو، اُن کے متعلق ہم یہ دیں گے کہ وہ رسول اللہؐ کی نہیں ہو سکتیں۔ پھر سن لیجئے کہ میں رسول اللہؐ کی کسی حدیث کا انکار نہیں کرتا۔ مذکورہ صدر معیار کی رُو سے، غلط روایات کے متعلق کہتا یہ ہوں کہ وہ رسول اللہؐ کی ہو نہیں سکتیں۔

شانِ نزول ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ جب تک قرآن کی آیات کا شانِ نزول معلوم نہ ہو، قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔ شانِ نزول سے مراد یہ ہوتی ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں کوئی واقعہ رونما ہوتا تھا اور اس سے متعلق قرآن کی کوئی آیت نازل ہو جاتی تھی۔ اوّل تو آپ دیکھئے کہ یہ تصوّر ہی قرآن کی ابدیت اور عالمگیریت کے منافی ہے۔ قرآن قیامت تک کے لئے، اور تمام نوعِ انسان کے لئے، ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ عالمگیر انسانیت کا کوئی تقاضا ایسا نہیں جس کے متعلق اس میں راہ نمائی نہ دی گئی ہو لیکن اگر اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ اس میں انہی واقعات کے متعلق ہدایت دی گئی ہے جو رسول اللہؐ کے زمانے میں اتفاقاً رونما ہو گئے تھے تو قرآن ایک مکمل ضابطۂ ہدایت کیسے ہو جائے گا؟ اس میں ان امور کے متعلق ہدایت مل نہیں سکے گی جو حضورؐ کے زمانے میں رونما

نہیں ہوئے تھے۔ نیز اس سے یہ بات بھی لازم آئے گی کہ اگر رسول اللہؐ دس بیس برس اور زندہ رہتے تو اس عرصہ میں کچھ اور واقعات رونما ہوتے۔ اس صورت میں موجودہ قرآن میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ لہٰذا موجودہ قرآن کو (معاذ اللہ) ناقص بھی تصور کرنا پڑے گا۔ بنا بریں یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے کہ قرآنی احکام صرف اُن واقعات کے سلسلہ میں نازل ہوئے تھے جو رسول اللہ کے زمانے میں ظہور پذیر ہوئے تھے، اور جب تک ان واقعات کا علم نہ ہو قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔

یہ تو شانِ نزول کے عقیدہ کے متعلق اصولی بحث تھی۔ اب یہ بھی دیکھئے کہ شانِ نزول کی روایات کس قسم کی ہیں۔ سورۂ حجر میں ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ (۱۵/۲۴-۲۵)

آیت کا مفہوم واضح ہے کہ جو لوگ دُنیا سے پہلے گذر چکے ہیں خدا انہیں بھی جانتا ہے۔ جو بعد میں جانے والے ہیں وہ اُن سے بھی باخبر ہے۔ خدا اُن سب کو اکٹھا کرے گا۔ اس مضمون کی کئی اور آیات قرآن میں موجود ہیں۔ اب یہ دیکھئے کہ کتبِ احادیث کی رُو سے اس آیت کی شانِ نزول کیا بیان کی گئی ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ

> ایک حسین ترین عورت (مسجد میں) رسول اللہؐ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ صحابہؓ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اسے نہ دیکھیں لیکن کچھ لوگ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے سے اسے جھانکتے رہتے تھے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اُتاری کہ ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی۔

یہ روایت کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔ میں نے اسے مثال کے طور پر اس لئے بیان کیا ہے کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ کتبِ احادیث میں شانِ نزول کی روایات کس قسم کی ہیں۔

ان تصریحات سے میرا مطلب یہ نہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس اسلاف کا سرمایہ چلا آرہا ہے، اسے دریا بُرد کر دینا چاہئے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے اُسے لینا چاہئے جو قرآن کے مطابق ہو ——— جو چیزیں قرآن کے خلاف ہوں اُنہیں ہمارے فہمِ قرآنی کے راستے میں روک بن کر کھڑا نہیں ہو جانا چاہئے۔ ہمارے فہم کی آزادی اور پابندی کی حدود قرآن متعین کرتا ہے اور اُسی کو سند اور حجّت ہونے کا حق حاصل ہے۔

---

(۵)

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ طریقہ جس سے میں نے قرآن سمجھا ہے اور اسی کے مطابق میں دوسروں کو بھی قرآن سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے درس کا یہی انداز رہا ہے اور اب بھی یہی انداز رہے گا۔ جو اربابِ ذوق اس طرح قرآن سمجھنا چاہیں وہ میرے درس سے مستفید ہو سکیں گے۔ لیکن جو اصولی طور پر اس طریق سے متفق نہ ہوں، انہیں اس درس سے ذہنی کشمکش اور قلبی ہیجان کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، قرآن سے وہی فیض یاب ہو سکتا ہے۔ جو پہلے سے قائم شدہ نظریات و معتقدات کو الگ کر کے اس کی بارگاہ میں آئے۔ اگر درس میں بیان کردہ امور میں سے کوئی بات وضاحت طلب ہو تو اُس کے متعلق آپ ہفتہ کے

مجھے مطلع کر دیں۔ میں آئندہ درس میں اُس کی مزید وضاحت کر دیا کروں گا۔ لیکن یہ چیز وضاحت طلبی کے لئے ہو، بحث و مناظرہ کی خاطر نہیں۔ ان باتوں کے لئے نہ میرے پاس وقت ہوتا ہے، نہ میں انہیں مفید ہی سمجھتا ہوں اسی لئے اس کی یہاں اجازت نہیں دی جاتی۔ میں نے ان امور کی وضاحت اس لئے بھی ضروری سمجھی ہے کہ جو حضرات آج پہلی بار تشریف لائے ہیں، انہیں معلوم ہو جائے کہ یہاں درس قرآن کا انداز کیا ہوتا ہے، اور اس میں شرکت کے آداب کیا ہیں؟

میں آخر میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ہمیں اپنی کتاب عظیم کے سمجھنے اور سمجھانے کے بعد اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝

قارئین اس ایک درس سے اندازہ لگالیں کہ پرویز صاحب کا ہفتہ واری درس کس قسم کا ہوتا ہے؟ لاہور میں یہ درس ہر جمعہ کی صبح (آج کل ساڑھے نو بجے) بی/ ۲۵ - گلبرگ ۲ میں ہوتا ہے۔ اور دیگر مقامات پر ٹیپ کے ذریعے۔ ان مقامات پر درس کا اعلان، ماہنامہ طلوعِ اسلام کی قریب قریب ہر اشاعت میں ہوتا رہتا ہے۔ طلوعِ اسلام۔

مطالب الفرقان کی پانچویں جلد

حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں سورۃ الانعام مکمل اور سورۃ الاعراف کی آیات (۱ تا ۱۵۸) آگئی ہیں۔ جو بیشتر مشتمل ہیں سابقہ حضرات انبیاء کرام کے کوائفِ حیات اور اقوامِ گذشتہ کی عبرت آموز داستانوں پر۔ جو احباب مطالب الفرقان کا مطالعہ کر چکے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس سلسلۂ تفسیر سے قرآنی حقائق و معارف کن تابانیوں سے واشگاف ہوتے ہیں۔ اس نے قرآن فہمی کا نیا باب کھول دیا ہے۔

پانچویں جلد بھی ادارۂ طلوعِ اسلام کے روایتی معیار کے مطابق کاغذ، طباعت اور تجلید کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ قیمت فی جلد -/۷۵ روپے (محصول ڈاک -/۶)

اس سلسلہ کی بقایا جلدوں کی قیمتیں حسب ذیل ہیں:-

جلد اول -/۶۰ روپے، جلد دوم -/۷۵ روپے، جلد سوم -/۷۵ روپے، جلد چہارم -/۹۰ روپے

سلیم کے نام خطوط کی جلدوں کی قیمتیں:-

جلد اول -/۲۵ روپے، جلد دوم -/۲۵ روپے، جلد سوم -/۲۵ روپے

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/ بی گلبرگ ۲۔ لاہور (۲) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار۔ لاہور